اردو ناول میں انسانی حقوق اور طبقاتی کشمکش کا شعور

ڈاکٹر صلاح الدین درویش*

Abstract

This research paper deals with the situation of human rights and class conflicts as shown in the tradition of Urdu Novel. The first part of the paper presents theoretical discussion on human rights. In the second part the works of the novelists like Nazir Ahmed, Hadi Ruswa, Prem Chand, Krishan Chander, Qurat-ul-ain Hyder, Anees Nagi, Intzar Hussain, Abdullah Hussain and Tarar have been analyzed in the light of their deep concern with the human rights and class conflict. The paper ends with the conclusion that these writers have been successful in their attempt to discuss these issues in their works.

انسانی حقوق سے مراد حقوق کا وہ مجموعہ ہے کہ جس کے تحت کسی بھی ریاست کی انتظامیہ اور مقنّنہ کو اپنی من مانی کرنے سے روکا جاتا ہے۔ کسی بھی ریاست کی انتظامیہ اور مقنّنہ کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ انسانی حقوق سے ماورا ہو کر انسانی تہذیب اور تمدن میں ناانصافی اور ظلم کو روا رکھے۔ عدلیہ کا یہ فرض تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسانی عزت و وقار کے ضامن انسانی حقوق کے اس مجموعے کے پیش نظر انسانی اور شہری آزادیوں کے شفاف تصور کو مسلسل اجاگر کرتی رہے۔ تاکہ شہریوں کو قانونی طور پر تحفظ بھی حاصل ہو اور وہ اپنی تمام تر شہری آزادیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے بنیادی انسانی حقوق کے پیش نظر اپنی شخصیت اور کردار کی نشوونما کر سکیں۔ رنگ، نسل، زبان، مذہب یا کسی بھی مسلک کی بنیاد پر ان حقوق کی فراہمی میں امتیاز نہیں برتا جا سکتا۔ ریاستی قوانین اور دساتیر ان انسانی حقوق کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ حکومتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ عوام کا بھی یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ ملکی قوانین کا احترام کریں، ریاستی معاملات میں تعاون کا رویہ اختیار کریں اور صحت مند معاشرے کی تکمیل کے لئے اپنا مئوثر کردار ادا کریں۔

انسانی حقوق کا عالمی تصور طے شدہ ہے۔ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر عالمی انسانی حقوق کے تصور کو اجاگر کرتا ہے۔ اقوام متحدہ کے تمام ممبر ممالک کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے معاشروں میں انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کی فہرست میں دیئے گئے تمام انسانی حقوق کو ریاستی، آئینی اور قانونی سطح پر تحفظ بھی فراہم کریں گے اور انہیں قابل اعتماد بنائیں گے۔ اس چارٹر کی تمہید میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ہر انسان کی عزت اور حرمت اور

* استاد شعبۂ اُردو، گورنمنٹ فیڈرل کامرس کالج، H/8 اسلام آباد۔

انسانوں کے مساوی اور نا قابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا دنیا میں آزادی انصاف اور امن کی بنیاد ہے۔ انسانی حقوق سے لاپرواہی اور ان کی بے حرمتی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تمام تر انسانی آزادیاں سلب ہو جائیں گی۔ اسی لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ انسانی حقوق کو قانون کی عملداری کے ذریعے یقینی بنایا جائے۔ ورنہ انسان خود ہی مجبور ہو کر جبر اور استبداد کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اعلان میں ممبر ممالک پر زور دیا گیا ہے کہ:

> ''انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا مشترک معیار ہوگا تا کہ ہر فرد اور معاشرے کا ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ان حقوق اور آزادیوں کا احترام پیدا کرے گا اور انہیں قومی اور بین الاقوامی اقدامات کے ذریعے ممبر ملکوں میں اور اُن قوموں میں جو ممبر ملکوں کے ماتحت ہوں' منوانے اور اِن پر عمل کروانے کے لئے بتدریج کوشش کرے گا''۔(1)

انسانی حقوق کے اس عالمی منشور پر عمل درآمد ظاہر ہے کہ تمام ممبر ممالک میں بیک وقت اور ایک ہی جیسا نہیں ہو سکتا۔ تاہم ان حقوق کے تحفظ کے لئے کی جانے والی ہر کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر معاشرہ اپنی اقدار' روایات' سیاسی اور معاشی نظام کے حوالے سے اپنے خاص معروضی تقاضے رکھتا ہے اور انہی تقاضوں کے تابع ہی انسانی حقوق کے عالمی منشور پر عمل درآمد ممکن ہے۔ غرض عالمی انسانی حقوق کا منشور تمام دنیا کے لئے ایک معتبر ترین دستاویز ہے اور دنیا بھر کے ممالک اور ان کے ریاستی دساتیر میں ان بنیادی انسانی حقوق کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ ہر ریاستی آئین میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور کو سراہا جاتا ہے اور اِس منشور کی شقوں کو قوانین کا حصّہ بنانے کا خاص اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے دستور کے حصہ دوم میں ''بنیادی حقوق اور حکمت عملی کے اُصول'' کی ذیل میں اس بات کی نشاندہی یوں کی گئی ہے:

> ''آئین میں حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے اور ان حقوق کے احترام اور اسی سلسلے میں باہمی تعاون پر زور دیا گیا ہے اور زبان' نسل اور مذہب کی بنیاد پر کسی کے حقوق سلب نہیں کیے گئے۔ آئین نے ان طریقوں اور ذریعوں کو بھی بیان کیا ہے کہ جن کے ذریعے ان حقوق کا عملی نفاذ کیا جا سکتا ہے۔ اس غرض سے دستور نے شہریوں کو وہ تمام بنیادی حقوق دیئے ہیں جو اقوام متحدہ کے عالمی انسانیت کے منشور سے منطبق ہیں۔ لہٰذا وہ تمام

قوانین جو اِن حقوق سے کسی بھی طرح متصادم ہوں دستور کی رو سے ناجائز ہیں اور انہیں عدالت میں چیلنج کیا جاسکتا ہے''۔(2)

انسانی حقوق کے عالمی منشور میں انفرادی، معاشرتی، معاشی، شہری، سیاسی اور بین الاقوامی انسانی حقوق کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اعلان میں جن ۳۰ دفعات کا ذکر کیا گیا ہے یہ دفعات انسانی حقوق کی ایک مؤثر فہرست پیش کرتی ہیں۔ان دفعات کی رو سے تمام انسان آزادی، حقوق اور حرمت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوتے ہیں۔انہیں ضمیر اور عقل کی دولت حاصل ہے، رنگ، نسل، زبان، جنس، مذہب، سیاسی نظریے، دولت، قومیت یا خاندانی حیثیت کی بنا پر انسانی حقوق کی فراہمی میں امتیاز نہیں کیا جاسکتا، ہر شخص کو اپنی ذات، زندگی اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے، غلامی کی ہر شکل کو کالعدم قرار دیا گیا، کسی بھی شخص کو ذلت آمیز سزا نہیں دی جاسکتی، ہر شخص کا یہ حق ہے کہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے، قانوں کی نظر میں سب برابر ہیں، کسی شخص کو بلا وجہ گرفتار، نظر بند یا جلاوطن نہیں کیا جاسکتا، ہر شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار اور خط و کتابت میں عدم مداخلت کو قانونی تحفظ حاصل ہوگا، ہر شخص کو اندرون ملک اور بیرون ملک نقل و حرکت یا مستقل سکونت کا مکمل حق حاصل ہوگا، ہر شخص کو قومیت کا حق حاصل ہے اور کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا، نسل، قومیت یا مذہب کی بنیاد پر بالغ مردوں اور عورتوں کو شادی بیاہ کے معاملے میں تحفظ حاصل ہے، ہر شخص ملکیت کا حق رکھتا ہے، ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے، اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی سے یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے، ہر شخص آزادی رائے کا حق رکھتا ہے اور انجمن سازی کرسکتا ہے، عوامی رائے دہی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی، ہر شخص کو بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے، ہر شخص کو آرام کرنے اور فرصت کے لمحات خوشگوار طریقے سے گزارنے کا حق رکھتا ہے، ہر شخص کو صحت، تعلیم، مکان، خوراک کی سہولتوں کا حق حاصل ہے، ہر شخص اپنی قومی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنسی، ادبی و فنی کتب کی تصنیف کا حق رکھتا ہے، یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جاسکتیں۔اسی طرح معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی حقوق کو بھی بین الاقوامی میثاق کی تفصیلات میں شامل کردیا گیا ہے۔

علاقائی و عالمی امن، رواداری، روشن خیال معاشرے کی ترویج، انصاف اور ہر نوع کی شہری آزادیوں کے حوالے سے انسانی حقوق کے عالمی منشور میں جتنی بھی دفعات شامل کی گئی ہیں وہ انسانی عظمت، عزت اور وقار کی

ضامن ہیں۔اس منشور میں انسان کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔اس کا موضوع بلاتفریق رنگ،نسل،مذہب،زبان اور عقیدے کے بنی نوع انسان کی بہتری ہے۔اس منشور کو ہم خالصتاً انسان دوست منشور قرار دے سکتے ہیں جو انسان دوستی کے تمام جملہ تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

انسان دوستی کی تحریک اور نظریے کا بنیادی موضوع بھی انسانی حقوق ہیں۔یہ انسانی حقوق ہی ہیں کہ جن کے حصول کے باعث انسان معاشرے میں بطور ''انسان'' اپنا معاشرتی اور کائناتی مقام پا سکتا ہے۔انہی حقوق کے فراہمی کی نتیجے میں انسان اپنے فرائض سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔حقوق کی عدم دستیابی کے باعث انسانی فرائض کا تصور بھی فنا ہو جاتا ہے۔انسانی تاریخ کے ارتقاء کے باعث ہر اس مہذب معاشرے میں کہ جو خود کو مہذب ہی کہلاتا ہو اس معاشرے سے ہر انسان دوستی کی تحریک یہ توقع رکھتی ہے کہ وہاں انسانی حقوق کو قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔اس اصول کے پیش نظر جو بھی معاشرہ جتنے زیادہ انسانی حقوق کی دستیابی کا مظہر ہوگا وہ اسی قدر مہذب اور اعلیٰ انسانی اخلاقیات اقدار اور روایات کا حامل سمجھا جائے گا،اسی طرح جس معاشرے میں انسانی حقوق کی جس قدر پامالی ہوگی وہ معاشرہ بھی اسی قدر غیر مہذب کہلائے گا اور ایسا معاشرہ اعلیٰ انسانی اخلاقیات،اقدار اور روایات سے بھی اسی قدر محروم سمجھا جائے گا۔انسانی حقوق کا تحفظ ہی کرہ ارض پر بسنے والے کروڑوں انسانوں کے خوشگوار،صحت مند اور روشن مستقبل کی اُمید ہے۔پس انسان ہی کو انسان کا نجات دھندہ سمجھا جاتا ہے اور یہی اصول انسانی دوستی کے نظریے کو رجائیت کا حامل بنا دیتا ہے۔

عالمی انسان دوست تحریکوں کے روح رواں پال کرٹز نے بھی اپنی کتاب "FORBIDDEN FRUIT: THE ETHICS OF HUMANISM" میں انسان دوستی کے موضوع کے لئے دس بنیادی نوعیت کے انسانی حقوق کا احاطہ کیا ہے۔اُنہوں نے اپنی اس کتاب میں دیگر اکتالیس انسانی حقوق کے مقابلے میں ان دس انسانی حقوق کو نظریہ انسان دوستی کی اساس قرار دیا ہے:

I. Right to life

1. Security and protection of one's person (freedom from fear)
2. Defense form external aggression.
3. Freedom from endangerment by the state.

II. Right to personal liberty

1. Freedom of movement and residence.
2. Freedom from involuntary servitude or slavery.
3. Freedom of thought and conscience.

4. Freedom of speech and expression.
5. Moral freedom
6. Privacy

III. Right to Health Care

IV. Freedom from want

1. Basic economic needs.
2. Right to work.
3. Care for elderty.
4. Right to leisure and relaxation.

V. Economic rights.

1. Right to own property.
2. Public property.
3. Right to organize.
4. Protection from fraud. .

VI. Intellectual and cultural freedom.

1. Free inquiry.
2. Right to learn.
3. Right to cultural enrichment.

VII. Moral equality.

VIII. Equal protection of law.

IX. The right to Democratic participation in Government.

1. Right to vote.
2. Legal right of opposition.
3. Civil liberties
4. Right of assembly and association.
5. Separation of church and state.

X. Right of marriage, family and childern."(3)

انسان دوستی کی عالمی تحریک کے تینوں منشوروں میں انسانی حقوق کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے لیکن اس حوالے سے تیسرا منشور ''HUMANIST MANIFESTO 2000'' بہت اہم ہے۔ اس کے مندرجات کے ساتویں حصے میں '' A PLANETARY BILL OF RIGHTS AND RESPONSIBILITIES'' کے عنوان سے عالمی سطح پر بعض نئے احداف کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے عالمی انسانی حقوق کے منشور کے نکات کو سراہتے ہوئے انسانی حقوق کے اس نئے بل میں جن دس احداف

کوشامل کیا گیا ہے اِن کے بارے میں وضاحت یہ کی گئی ہے کہ یہ احداف اکیسویں صدی کے عالمی مسائل، تقاضوں اور ترجیحات کا احاطہ کرتے ہیں اور یہ کہ یہ احداف نوع انسانی کا انسانی حقوق کے حصول کا اگلا مرحلہ ہے۔ یہ دس احداف درج ذیل ہیں:

"First we should strive to end poverty and every where and to provide advocate health care and shelter for people energuhere on the planet.

Second, we should strive to provide economic security and advocate income for everyone.

Third, every person should he protected from unwarranted and unnecessary injury, danger and death.

Fourth, individuals should have the right to live in a family unit or household of their choice, consonant with their income, and should home the right to bear or not to bear children.

Fifth, the opportunity for education and cultural enrichment should be universal.

Sixth, individuals should not be discriminated against because of race, ethic origin, nationality, culture, caste, class, creed, gender or sexual orientation.

Seventh, the principles of equality should be respected by civilized communities.

Eighth, it is the right of every person to be able to live a good life pursue happiness, achieve creative satisfaction and leisure in his or her own terms, so long as he or she does not harm others.

Ninth, individuals should have the opportunity to appreciate and participate in the arts-including literature, poetry, drama, sculpture, dance, music and song.

Tenth, individuals should not be unduly restrained,

restricted, or prohibited for exercising a wide range of personal choices." (4)

دنیا بھر کے دساتیر میں بنیادی حقوق کی فراہمی کو سب سے بڑی ریاستی، قانونی اور سماجی ذمہ داری قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان دساتیر میں بنیادی حقوق کو خاص اہتمام کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے اور اس بات کی قانونی حیثیت قرار دی جاتی ہے کہ انسانی حقوق کہ جن کا اندراج ان دساتیر میں کیا جاتا ہے اُنہیں نہ صرف یہ کہ قانونی تحفظ حاصل ہے بلکہ ان بنیادی حقوق کے منافی جتنے بھی قوانین ہوں گے کالعدم قرار پائیں گے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے 1973ء کے آئین میں ان بنیادی انسانی حقوق کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ اِس آئین کے پہلے ہی باب میں بنیادی انسانی حقوق کو آرٹیکل آٹھ تا ستائیس شامل کر دیا گیا ہے۔ بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ آرٹیکل آٹھ کی پہلی اور دوسری شق میں یوں کیا گیا ہے:

''۱: کوئی قانون، رسم یا رواج جو قانون کا حکم رکھتا ہو، تناقص کی اس حد تک کالعدم ہوگا جس حد تک وہ اس باب میں عطا کردہ حقوق کے منافی ہو۔

۲: مملکت کوئی ایسا قانون وضع نہیں کرے گی جو بایں طور عطا کردہ حقوق کو سلب یا کم کرے اور ہر وہ قانون جو اس شق کی خلاف ورزی میں وضع کیا جائے گا اُس خلاف ورزی کی حد تک کالعدم ہوگا۔''(5)

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے 1973ء کے آئین میں بھی وہ تمام انسانی حقوق کہ جن کی نوعیت عالمی ہے اور جن کی حیثیت اور مقام کو ساری دنیا میں مسلمہ قرار دیا جاتا ہے ایسے تمام انسانی حقوق کی روح بدرجہ اُتم موجود ہے۔ اس آئین میں فرد کی زندگی اور آزادی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، ہر شخص کو گرفتاری اور نظر بندی سے تحفظ فراہم کیا گیا ہے، گرفتاری اور نظر بندی کی وجوہ سے آگاہ کیے بغیر کسی بھی فرد کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جا سکتا، غلامی اور بیگار کو شرف انسانی کے خلاف قرار دیا گیا ہے، ہر شخص کو چادر اور چار دیواری کا تحفظ فراہم کیا گیا ہے، پاکستان کے ہر شہری کو اندرون ملک آزادانہ نقل و حرکت کی مکمل آزادی حاصل ہے، ہر شخص کو جلسے جلوس اور انجمن سازی کی آزادی حاصل ہے، سرکاری ملازمین بھی کسی سیاسی جماعت میں شامل ہوئے بغیر انجمن سازی کر سکتے ہیں، تمام شہریوں کو یکساں طور پر تجارت، کاروبار یا پیشے کے اختیار کی آزادی حاصل ہے، ہر شہری کو شہری جائیداد کا حق حاصل ہے، پاکستان کے تمام شہری بلا تفریق، رنگ، نسل، مذہب، جنس، زبان قانونی طور پر مساوی حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح

ملازمتوں میں بھی ہر نوع کے امتیاز کے خلاف تحفظ حاصل ہے' ہر شہری اور طبقے کو اپنی زبان' رسم الخط اور ثقافت کو برقرار رکھنے اور اسے فروغ دینے کا حق حاصل ہے۔غرض 1973ء کے آئین میں پاکستان کے معروضی تقاضوں کے پیش نظر اہم ترین انسانی حقوق کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ایک آزادانہ جمہوری روایات کے حامل معاشرے ہی میں انسانی حقوق کا شعور پنپتا ہے۔ایک ایسا معاشرہ کہ جہاں ریاستی سطح پر انسانی حقوق کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے' وہاں سماجی' نفسیاتی اور ثقافتی سطح پر ایسی اقدار جنم لینے لگتی ہیں کہ جس کے باعث انسانی حقوق کی پامالی' روزمرہ معاملات کا عمومی حصہ بن جاتی ہے۔آمرانہ حکومتوں میں جب شہریوں کے بنیادی انسانی حقوق کو سلب کر لیا جاتا ہے تو ردِعمل کے طور پر معاشرے میں ایسی اخلاقیات جنم لیتی ہیں کہ جو رفتہ رفتہ انسانی عظمت کی حامل اعلیٰ قدروں کو برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔مثال کے طور پر تحریر وتقریر پر پابندی کے باعث مؤثر تنقید کا سائنسی' نظریاتی اور اخلاقی نظام بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔گھٹن کا ماحول نفرت' بےزاری' عدم وضاحت اور متشدد انفرادی اور گروہی سوچ کو جنم دیتا ہے۔ایک انسانی سماج میں انسانوں کے مختلف طبقات بطور انسان اپنے آپ کو سیاسی اور سماجی ذمہ داریوں سے آگاہ سمجھتے ہیں' وہ اعلیٰ انسانی اقدار اور اخلاقیات کا شعور بھی رکھتے ہیں۔پس' وہ اپنے لئے اس بات کا مکمل استحقاق بھی رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ جس بات' فیصلے' ارادے یا عمل کو انفرادی یا طبقاتی سطح پر درست سمجھتے ہیں وہ اس کا آزادانہ عملی اظہار بھی کریں' وہ اپنے اس انسانی استحقاق کے حوالے سے کسی بھی نوع کا دباؤ نہیں چاہتے۔بھلے اُن کا یہ اظہار کسی حکومت کے لئے ناپسندیدہ ہی کیوں نہ ہو۔انسان اپنی غلطیوں کے ذریعے بھی علم' دانش اور نیکی کے اعلیٰ تصور سے آگاہ ہوسکتا ہے لیکن محض انسان کے گمراہ ہونے کے تصور سے اُس کی اظہار کی تمام تر آزادیوں پر پہرے نہیں بٹھائے جاسکتے۔ولیم او ڈگلس اپنی کتاب ''بنیادی انسانی حقوق کا مسئلہ'' میں آزادیِ اظہار کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بےشک ایک تقریر سے خطرناک نتائج بھی برآمد ہوسکتے ہیں اور یہ لوگوں کو تشدد پر بھی اُبھار سکتی ہے لیکن تاریخ اِس امر کی شاہد ہے کہ خیالات کو دبائے رکھنا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے''۔(6)

حکومتِ وقت سے بعض معاملات پر اختلاف بھی دراصل انسان کی سماجی ذمہ داری کا آئینہ دار ہوتا ہے۔یہی سماجی ذمہ داری آزادیِ اظہار کا دوسرا نام۔ایک ادیب کی سماجی ذمہ داریوں سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی واضح کرتے ہیں:

''رہا سماجی ذمہ داری کے سلسلہ میں حکومت کا سوال تو یہاں اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ حکومتِ وقت سے اختلاف

کرنا یا اس کا مذاق اڑانا یا اُس سے انحراف کرنا وطن دشمنی نہیں ہے اور نہ غداری۔ یہی وہ چیز ہے جسے ہم اصطلاح میں ''آزادی اظہار'' کا نام دیتے ہیں''۔(7)

انسان دوست فکر کی ترویج میں جمہوریت اور آزادی ہی وہ بنیادی شرائط ہیں کہ جن کے باعث انسانی حقوق کا شعور نشوونما پاتا ہے۔ آزادی اظہار دراصل وہ بنیادی انسانی حق اور وسیلہ ہے کہ جس کے ذریعے ادب اور فنونِ لطیفہ ترقی کرتے ہیں۔ انسان دوست مفکر کارلس لیمانٹ کے بقول:

"The Humanist stress on complete cultural democracy and freedom of expression means that artists and writers should have the widest latitude in what they produce and say. A free art and a free literature are absolute essentials for a free culture."(8)

انسانی حقوق کے عالمی منشور میں شہری اور سیاسی حقوق کے میثاق کی دفعہ اُنیس میں اس جانب واضح اور دو ٹوک الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

''1. ہر شخص کو کسی مداخلت کے بغیر اپنی رائے رکھنے کا حق ہوگا۔

2. ہر شخص کو اظہار خیال کا حق ہوگا۔ ان حقوق میں معلومات اور ہر قسم کے افکار کی جستجو کرنے اور زبانی، تحریری یا مطبوعہ شکل میں یا فنونِ لطیفہ کی صورت میں یا اپنی پسند کے کسی اور وسیلے سے دوسروں تک اپنی رائے پہنچانے کا حق بھی شامل ہے۔''(9)

غرض آزادی اظہار کا حق تمام تر انسانی حقوق کے حصول کا بنیادی سرچشمہ ہے اور ادب آزادی اظہار کے بنیادی انسانی حق کا مؤثر وسیلہ ہے۔

ناول چونکہ انسانی زندگی کا ترجمان ہے اسی لئے اس میں زندگی کے وہ تمام رنگ موجود ہوتے ہیں کہ جن سے زندگی کی حقیقت اور خواب میں رنگ بھرے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی کے بقول:

''ناول کیا ہے تو اس کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ ناول انسانی زندگی کا بھرپور مطالعہ ہے۔ یہ زندگی کے اہم واقعات کا بیان نہیں بلکہ حقیقت کی ایک سچی تصویر ہے جس میں ناول نگار کے تجربے اور خواب ہم آہنگ ہو کر قوسِ قزح کا منظر پیش کرتے ہیں۔ ناظر جب اس تصویر کو دیکھتا ہے تو کچھ دیر کے لئے اس کے پس منظر میں کھو جاتا ہے۔ پھر کچھ مسائل کبھی تارے، کبھی چاند اور کبھی سورج بن کر اُس کے سامنے اُبھرتے ہیں جن سے زندگی کی سچائی، تلخی، نشاط اور کرب کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ اس طرح ناول زندگی کی تصویر ہی نہیں اس کی ہمہ رنگ تفسیر بھی ہے''۔(10)

ایک اچھے ناول کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ اس میں زندگی کی سچائیوں ہی کو نہ پیش کیا جائے بلکہ ان سچائیوں کا شعور بھی فراہم کرے۔ صداقت کا شعور ناول میں جہاں معنی پیدا کرتا ہے۔ انسانی زندگی کی مسرتیں جہاں انسان کو زندگی کی تلخیوں میں جینے کا حوصلہ بخشتی ہیں وہاں انسانی زندگی کی بے قدری' حقوق کی پامالی' مقہوری اور مجبوری انسانی شخصیت' کردار' آدرشوں اور شعور کو بھی متاثر کرتی ہے۔ ایک ناول نگار جب انسانی زندگی کو موضوع بناتا ہے تو وہ کائنات اور معاشرے میں انسانی عظمت اور اُس کے وقار کا احیاء چاہتا ہے۔ وہ فرسودگی' شکست' زوال اور انسانی بے توقیری کی چٹان میں دراڑ ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنے مضمون ''ناول کی عظمت اور ضرورت'' میں اس خوبی سے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک اچھا اور بڑا ناول کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے بشرطیکہ قاری ادب کا عاشق ہو اور یہ سمجھتا رہے کہ ادب ہماری تہذیبی ضرورت ہے۔ بیسویں صدی کو ہم پر آشوب قرار دے سکتے ہیں۔ ایک طرف زبردست ایجادات تو دوسری جانب جنگ و جدل و معاشی و سماجی بحرانوں کے ادوار۔۔۔۔ زندگی کے ان پُر آشوب مراحل میں ناول اپنی مخصوص صورتحال کو سمجھنے اور ان حقائق سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کرتا ہے جو اکثر ہماری سوچ سے دور رہتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ فرسودہ نظریات اور شدید طور سے نقصان دہ روایات اور رسومات کی جکڑ بندیوں میں گرفتار رہتے ہیں اور اپنی اپنی انفرادی زندگیوں کو جہنم بنا لیتے ہیں اور سُرنگ کے دوسری طرف روشنی کو نہیں دیکھ پاتے۔ ناول ہمیں روشنی دکھا سکتا ہے''۔(11)

اردو ناول کی تاریخ اگرچہ اتنی پرانی نہیں ہے۔ تاہم اس میں اُس روشنی کا سراغ ضرور ملتا ہے کہ جس کی طرف ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے اشارہ کیا ہے۔ اُردو ناول برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں رونما ہونے والے المیوں' حالات و واقعات' سیاسی' سماجی اور معاشی ابتری' انسان کی بے توقیری و بے بسی کے سامنے خاموش تماشائی بن کر نہیں رہا اور نہ ہی کبھی انسانی عظمت اور وقار کو ناول کے موضوعاتی اعتبار سے ثانوی حیثیت دی ہے۔ جنگ' نفرت اور تعصب کی ہوا میں جب بھی کبھی انسانی حقوق کی پامالی کے شعلے بھڑکے اُردو ناول نے آگے بڑھ کر نا صرف اِس پر احتجاج کیا بلکہ انسانی حقوق کی اہمیت اور شعور کو اُجاگر کرنے میں اپنا موثر کردار ادا کیا۔

اُردو ناول نگاری کا آغاز 1857ء کے حالات کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان مغلیہ اقتدار کے خاتمے کے ساتھ ہی احساس شکست کے باعث مایوس اور دل گرفتہ ہو چکے تھے۔ اُدھر انگریز حکمران مسلمانوں ہی کو 1857ء کے حالات کا ذمہ دار سمجھ رہے تھے۔ اِس صورت حال میں سرسید احمد خان نے قوم کو مایوسی

سے نکالنے اور انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی بدگمانیوں کے خاتمے کے لئے علم بلند کیا۔ اس دوئی اور بدگمانی کے خاتمے کے لیے سرسید احمد خان نے جدید مغربی علوم کی تحصیل کو پُل بنایا اور اپنے قول اور عمل کے ذریعے مسلمانانِ ہند کو یہ باور کرایا کہ جدید علوم کے حصول کے ذریعے ہی وہ مہذب اقوام کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد ایسی بھی تھی کہ جو ان علوم کی تحصیل کے خلاف تھی۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ سرکاری ملازمتوں کو بھی ناجائز خیال کرتے تھے۔ سرسید نے ان مخصوص حالات میں گویا اجتہاد کا کام کیا۔ علی عباس حسینی کے بقول:

''ایک جانب تو حاکموں نے سارے فساد کا ذمہ دار مسلمانوں کو سمجھا' دوسری طرف شریعتِ اسلامی کے خود ساختہ حاملوں کا یہ فتویٰ باقی رہا کہ انگریزی تعلیم ناجائز ہے اور ملازمت سرکاری حرام۔ خدا بھلا کرے سرسید اور اُن کے ساتھیوں کا کہ اُنہوں نے قومی خطرے کی صحیح نباضی کی۔ اِدھر اِن ملّا یانِ مسجدی سے جہاد بالقلم جاری کیا اُدھر ارا کین سلطنت کے دلوں سے کدورت دھونے کی کوشش کی''۔(12)

تعلیم انسانی حقوق کی فہرست میں ممتاز ترین انسانی حق ہے اور ہر نوع کی سیاسی' سماجی' معاشی اور مذہبی تعلیم کی تحصیل کو بلا تفریق رنگ' نسل' مذہب اور عقائد کے سب انسانوں کے لئے یکساں مفید اور ضروری قرار دیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان عہد زوال میں جنم لینے والے مخصوص حالات و واقعات کے باعث تعلیم اور خصوصاً علم جدید کی تحصیل میں پیچھے رہ گئے۔ سرسید نے سب سے پہلے اِس مسئلے کی نشاندہی کی اور جدید علوم کے حصول کے لئے مسلمانوں کے آئندہ مستقبل کی پیش بینی کرتے ہوئے اِس سلسلے میں عملی اقدامات بھی اُٹھانا شروع کر دیے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول:

''سرسید اور اُن کے رفقائے کار کی جہد مسلسل سے تعلیمی' سماجی اور ادبی مورچے تسخیر ہوئے اور اِن پر افکارِ نو کے پرچم لہرا دیے گئے۔ اُنہوں نے بدلے ہوئے حالات کا حل جدید تعلیم میں تلاش کیا۔ چنانچہ تعلیم کو قومی امنگوں کا آئینہ دار بنانے کے لئے اُنہوں نے شدید مخالفتوں کے باوجود علی گڑھ میں جس درسگاہ کی بنیاد رکھی وہ ہندوستان میں ایک نیا تعلیمی تجربہ ثابت ہوئی اور بعد ازاں یونیورسٹی کے روپ میں پاکستان کی تحریک کے لئے سرگرم کارکن مہیا کرنے کا باعث بنی''۔(13)

سرسید کی اس تعلیمی تحریک کے ایک حامی نذیر احمد نے عورتوں کی تعلیم کی غرض سے اسی عہد میں دو قصّے تحریر کیے۔ یہ دونوں قصّے اُردو ناول نگاری کی تاریخ میں ناول نگاری کے اولین نمونے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان

مردوں کی تعلیم کے لئے پھر بھی کسی نہ کسی حد تک تعلیمی ادارے موجود تھے تاہم عورتوں کی تعلیم کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔عورتوں کے اس بنیادی انسانی حق کے احساس کو نذیر احمد نے اپنے ان ناولوں میں اجاگر کیا۔خود سرسید بھی عورتوں کی تعلیم کے زیادہ حق میں نہ تھے لیکن انہی کے ایک ہمدرد نذیر احمد نے عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ دینے کی ضرورت کو بھی پیش نظر رکھا۔چنانچہ امورِ خانہ داری کی تعلیم کے لئے ''مراۃ العروس'' واقفیت عامہ کی غرض نے ''بنات النعش'' اور خدا پرستی کا شعور پیدا کرنے کے لئے ''توبتہ النصوح'' تحریر کیا۔اسی طرح ''ابن اوقت'' میں یورپ کی ترقی کا راز جدید علوم کی تعلیم کو قرار دیا۔

نذیر احمد کے ناول ''بنات النعش'': کی اصغری علم اور عمل دونوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔وہ اپنے حسن عمل کے ذریعے تمام سسرال کے دل جیت لیتی ہے اور گھر کی تمام عورتوں کو تعلیم کے فوائد سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مکتب کا بھی آغاز کرتی ہے۔جس میں امیر' غریب' بدوضع اور خوش شکل ہر نوع کی لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ہر انسان کو بغیر کسی امتیاز کے پورے عزت واحترام کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہے۔اس ناول کے مرکزی خیال میں اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔اس ناول کی ''حسن آراء'' چونکہ بالائی طبقے سے تعلق رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ شرفاء اور غریبوں کی بیٹیاں ایک ہی چھت تلے پڑھیں۔اصغری کی نند محمودہ اُسے سمجھاتی ہے کہ جولاہے' موچی' سنار' بڑھئی لوہار وغیرہ سب ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں پس معاشرے کے سب افراد ایک دوسرے کے محتاج ہیں کہتی ہے:

''مگر جوتی والا (موچی) حقیقت میں روپیہ کا محتاج نہیں بلکہ وہ اس چیز کا محتاج ہے جس کے بدلے جوتی کی قیمت خرچ کرے گا۔غرض کہ روپے والا زیادہ محتاج ہے اور اگر زیادہ نہیں تو جوتی والے کے برابر سہی پھر گھمنڈ کس بات کا''۔(14)

اسی ناول میں ایک دیہاتی عورت خیر النساء کا کردار بھی بڑا اہم ہے جو سادگی' محنت ومشقت' سچائی' دیانت اور معصومیت کے اوصاف کی بیک وقت حامل ہے۔اِس کردار کے ذریعے نذیر احمد نے شہری شرفاء کی نمود ونمائش اور چھچھورے پن کا مذاق اُڑایا ہے کہ ان کی عورتوں میں کوئی ہُنر نہیں ہوتا جو غریبوں اور محتاجوں کو گھر کی چوکھٹ سے گالیاں اور دھکے دے کر نکالتی ہیں خود کو بڑا سمجھتی ہیں کہ اُن کے پاس دولت ہے جب کہ باقیوں کو حقیر خیال کرتی ہیں۔خیر النساء کے ذریعے ذات پات کی تقسیم کے خلاف نذیر احمد نے خوب کام لیا ہے۔خیر النساء کہتی ہے کہ دیہات میں شکل وصورت دیکھی جاتی ہے نہ ذات برادری نہ پیشہ جواباً اصغری کہتی ہے:

''آدمی آدمی سب برابر، فخر کی بات اگر ہے تو ہُنر ہے''۔(15)

نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' کا ھیرو حجتہ الاسلام نہیں ہے بلکہ ابن الوقت ہے۔ ناول کا یہ نام نذیر احمد نے سوچ سمجھ کر ہی رکھا ہوگا۔ چنانچہ اس کردار کی نشونما پر نذیر احمد نے زیادہ توجہ دی ہے۔ اس ناول کا ابن الوقت اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ ولایت میں حاکم اور محکوم کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اُس کا خیال ہے کہ سول سروس کے امتحانات کے باعث انگریزوں اور ہندوستانیوں میں بھی صلاحیت اور اھلیت کے اس معیار کے باعث کوئی فرق نہ رہے گا۔ حجتہ الاسلام طبقاتی اونچ نیچ کو مقدر کا لکھا قرار دیتا ہے جب کہ ابن الوقت کے نزدیک یہ سوچ جہالت پر مبنی ہے وہ تمام انسانوں میں اھلیت کی بنیاد پر برابری کا دعویدار ہے۔ اُس کے بقول:

''اگر دنیا میں اونچ نیچ خوشی اور رنج یعنی اختلاف حالات امر تقدیری ہی ہے تو خدا کو دانشمند اور منصف اور رحیم ماننا مشکل ہے''۔(16)

ابن الوقت انگریزوں کی علمی اور تہذیبی پیروی کو بھی فرد کے آزادانہ انتخاب کا بنیادی حق سمجھتا ہے۔ اسی طرح وہ مذہب کی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی وحشت اور تشدد کے بھی خلاف ہے اور انگریز حکام کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ دونوں مذاہب کے مذہبی مقامات کا احترام کریں تا کہ کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کی دل آزاری نہ ہو۔

غرض نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں چند بنیادی نوعیت کے انسانی حقوق کی اہمیت کی ترجمانی کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تہذیبی وتمدنی ارتقاء میں عورتوں کو تعلیم کا حق، ذات پات، امارت، غربت سے ماوراہر انسان کو مساوی عزت واحترام کا حق، ایک دوسرے کے مذہبی اعتقادات کا احترام اور دولت اور اثر ورسوخ کی بجائے صلاحیت، ہنر اور اہلیت کی بنیاد پر انسانوں میں مساوات کا حق، ایسے انسانی حقوق ہیں کہ جن کی پامالی کے باعث معاشرہ افراط وتفریط، بدحالی اور زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان انسانی حقوق کی نشاندہی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں جس انداز پر کی ہے وہ بذات خود نذیر احمد کی ''آزادی اظہار'' کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان موضوعات پر آزادی کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں بھی اتنی آزادی کے ساتھ طبع آزمائی نہ ہو سکی۔

ہر نوع کی سائنسی، سماجی اور فنی معلومات تک رسائی، اُسے دوسروں تک پہنچانے اور معاشرتی ترقی کے لیے ان مفید معلومات سے آگاہی ہر انسان کا حق ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نذیر احمد کے بعد راشد الخیری نے اپنے دو ناولوں ''صبح زندگی'' اور ''شام زندگی'' میں ایسی مفید معلومات کو تمام لوگوں خصوصاً عورتوں تک پہنچانے کے لئے ناول

کو ذریعہ بنایا تا کہ معاشرے میں جہالت' تنگ نظری' عدم مساوات اور غلط رسوم و رواج کا خاتمہ ہو سکے۔ معاشرے کے تمام افراد خصوصاً عورتیں اپنے حقوق و فرائض سے آگاہ ہو سکیں۔ ٹونے ٹوٹکوں اور گنڈے تعویز جیسی خرافات کے حامل معاشرے میں تعلیم نسواں کی حمایت کرنا اور جدید سائنسی معلومات سے آگاہ کرنا اس عہد میں معمولی بات نہ تھی۔ سائنسی شعور کی فراہمی میں ایسی معلومات یقیناً اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر راشد الخیری کے ناول ''شامِ زندگی'' کی نسیمہ جو گھر داری کے معاملات میں بھی طاق ہے اپنی نندوں کو سمجھاتی ہے:

''زمین سمیت گیارہ ستارے ہیں جو آفتاب کے گرد گھوما کرتے ہیں۔ زمین ایک گھنٹہ میں اٹھاون ہزار میل کے قریب چکر کر جاتی ہے۔ تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ستاروں میں دنیا بسی ہوئی ہے۔ پہاڑ وہاں' بادل وہاں' برف وہاں' ہوا وہاں۔ یہ بھی سن لو کہ جب سورج اور چاند کے بیچ میں زمین گھومتی ہے تو ''چاند گرہن'' ہوتا ہے اور جب سورج اور زمین میں چاند آپڑے تو ''سورج گرہن'' ہو جائے گا''۔(17)

اِسی نوع کی دیگر معلومات کی ترسیل کے ذریعے راشد الخیری نے بھوت پریت کے کرشمات کی بجائے سائنسی علوم میں دلچسپی کے باعث نظامِ کائنات کے صحیح ادراک کا راستہ ہموار کیا۔ اور' معلومات کی فراہمی کے اِس بنیادی حق کو پہنچانے کا ذریعہ ناول کو بنایا۔ نذیر احمد اور راشد الخیری کی اپنی نوعیت کی یہ کاوشیں انسانی حقوق کے شعور کو اجاگر کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔

کسی کو اغوا کرنا' اپنی پسند کا پیشہ اختیار کرنے پر کسی کو مجبور کرنا اور اس سے اس کی پسند یا مرضی کے مطابق آزاد زندگی گزارنے کے حق سے محروم رکھنا' انسانی حقوق کی پامالی کے زمرے میں آتا ہے۔ مرزا ھادی رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کی امیرن' جسے بعد میں امراؤ بیگم کا نام دیا جاتا ہے' بھی ایک ایسی بچی تھی جو ابھی گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی لیکن دلاور خان اسے اغوا کر کے ایک ڈیرہ دار طوائف کے کوٹھے پر پہنچا دیتا ہے۔ اس کی زندگی میں آنے والی تمام تلخیوں کا سبب طوائف ہونا ہے۔ اسے زوال پذیر لکھنوی معاشرت میں ایک مقام تو مل جاتا ہے لیکن عزت' احترام اور انسانی مساوات سے محروم رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا سگا بھائی بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ فیض آباد کے جس محلے میں اسے مجرے کے لئے بلایا جاتا ہے وہ امراؤ کا محلّہ تھا' اسے بچپن کی تمام نشانیاں یاد آجاتی ہیں' گھر پہنچتی ہے تو بھائی چھری سے حملہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی عزت و غیرت اور نام و ناموس پر امراؤ کو کلنک کا ٹیکہ سمجھتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ وہ فیض آباد چھوڑ کر واپس لکھنو چلی جائے۔ چنانچہ وہ دوبارہ خانم کے ڈیرے پر آجاتی ہے۔ اسی جہنم میں اپنی زندگی کے دن بتا دیتی ہے۔ جوانی ڈھل جاتی ہے تو بڑھاپا ایک رنڈی کی زندگی کو اجیرن بنا

دیتا ہے۔ بقول امراؤ:

''رنڈی کے لئے بڑھاپا دوزخ کا نمونہ ہے۔ بڑھیا فقیرنیاں جو لکھنو کے گلی کوچوں میں پڑی پھرتی ہیں اگر غور کیجئے گا تو ان میں اکثر رنڈیاں ہیں''۔(18)

کسی عورت کا طوائف بنایا جانا' اس کی مرضی کے خلاف ایسا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دینا' اسے اغوا کرنا اور بطور انسان اس کی ہتک کرنا انسانی حقوق کے خلاف ہے۔ اس حوالے سے اگر ناول ''امراؤ جان ادا'' کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اس ناول میں ان انسانی حقوق کی پامالی سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ ھادی رسوا کا ان انسانی حقوق کا گہرا ادراک بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس ناول میں طوائف کا موضوع ایک طوائف کے کردار کی عظمت نہیں ہے بلکہ طوائف کے کردار کے ذریعے انسانی حقوق کی پامالی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

برصغیر کے مخصوص تاریخی تناظر میں انسانی حقوق کا گہرا شعور ہمیں پریم چند کے ناولوں میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک مقصدی ناول نگار ہیں۔ ادب میں افادی پہلو کا نظریہ بھی دراصل ان انسانی حقوق کا آئینہ دار ہے کہ جن کے بغیر انسان کی تہذیبی اور تمدنی زندگی گوں ناگوں مسائل اور المیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہندوستانی سماج میں موجود ذات پات کے گہرے نظام' طبقاتی تفریق' فرسودہ مذہبی روایات' رسوم اور توہم پرستی' سود خور مہاجنی نظام اور جاگیرداری عہد سے مخصوص اقدار ہندوستانی سماج کی ایسی جہتیں ہیں کہ جن کے باعث انسانی حقوق کے مسائل ہمیشہ درپیش رہے۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی سماج کی ان تمام جہتوں کو پیش کیا ہے۔ ان کے انسان دوستی کے مسلک میں انسانی حقوق کی فراہمی مرکزی نظریے کے طور پر ابھرتی ہے۔ وہ کوئی بھی ناول محض کہانی لکھنے کے خیال سے نہیں لکھتے بلکہ ہر ناول کی کہانی میں انسانی حقوق کے شعور سے آگاہ کرنا ایک واضح نصب العین ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے مخصوص سماجی نظام میں شادی کے معاملے میں عورت کی رضامندی کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ بعض اوقات اس کے باعث بڑے مسائل جنم لیتے ہیں۔ ہر عاقل اور بالغ مرد کا یہ انسانی حق ہے کہ اسے اس معاملے میں مکمل آزادی ہو۔ اسی طرح ہر عاقل اور بالغ عورت بھی اس انسانی حق سے محروم نہیں رکھی جا سکتی ۔ اس حق کی پامالی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عورت کو سماجی اور معاشی تحفظ کے لئے مرد کا دست نگر بن کر رہنا پڑتا ہے۔ عورت کی اپنی سماجی حیثیت اور معاشی تحفظ دو ایسی ضروریات ہیں کہ جن کے بغیر عورت شادی کے لئے مرد کے انتخاب کے معاملے میں محروم رہتی ہے۔ اس حق کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ خود سماجی اور معاشی طور پر مرد کی طرح خود مختار ہو۔ پریم چند ناول ''نرملا'' میں ایک بے جوڑ شادی کے المیے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ نرملا کا باپ

جوایک کامیاب وکیل ہوتا ہے ایک بدمعاش جسے اس نے سزادلوائی ہوتی ہے کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے' اس کی بیوی کلیانی سماجی اور معاشی سطح پر شدید دباؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔ خاندان کی گرتی ہوئی مالی ساکھ کے پیش نظر نرملا کی بات جہاں طے ہوتی ہے' انکار کر دیتے ہیں۔ بے آسرا بیوہ کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ گڑیوں سے کھیلنے والی پندرہ سالہ نرملا کو تین جوان بیٹوں کے باپ وکیل طوطا رام سے بیاہ دیتی ہے۔ اس سلسلہ میں نہ تو اس سے پوچھا جاتا ہے اور نہ ہی وہ انکار کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ ناول میں نرملا کے جذبات کی ترجمانی یوں کی گئی ہے:

''دل روتا تھا مگر ہونٹوں پر ہنسی کا سوانگ بھرنا پڑتا تھا۔ جس کا منہ دیکھنے کو جی نہ چاہتا ہو اس کے آگے ہنس ہنس کر باتیں کرنی پڑتی تھیں۔ جس بدن کا چھونا اس کو سانپ کے سر و چشم کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس سے لپٹ کر جتنی نفرت اور دلی اذیت ہوتی تھی اسے کون جان سکتا تھا''۔(19)

محض شادی کے لئے مرد کے انتخاب کا حق نہ ہونے کے باعث نرملا کی ساری زندگی بوڑھے طوطا رام کے ساتھ اذیتوں میں بسر ہوتی ہے۔ اسی طرح ہندو سماج میں بیوہ ہر نوع کے انسانی حقوق سے محروم قرار دے دی جاتی ہے۔ اسے تو زندگی کا بھی بنیادی انسانی حق حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ اس بات کو مذہبی نقطہ نظر سے تقدس کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ وہ شوہر کی ارتھی کے ساتھ ہی جل مرے یعنی ستی ہو جائے۔ ایسے سماج میں بیوہ کے انسانی حقوق کی بات کرنا انسان دوستی کا اعلیٰ نصب العین ہے۔ چنانچہ پریم چند نے اپنے ناول ''بیوہ'' میں بیوہ عورتوں کے انسانی حقوق کی ترجمانی کی ہے کہ اسے کسی بھی طور پر سماج کے فکری اور عملی دھارے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس ناول میں پریم چند نے ''بدھوا آشرم'' کو ایسی عورتوں کی پناہ قرار دیا ہے اور اس ادارے کی ضرورت سے آگاہ کیا ہے۔

ہر انسان کو آزادی فکر و نظر' ضمیر کی آزادی اور مذہب کی آزادی کا پورا حق حاصل ہے' وہ جب چاہے اپنے عقیدے کو تبدیل کر سکتا ہے' انفرادی یا اجتماعی طور پر یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ کر سکتا ہے۔ اپنی مذہبی رسومات یا تعلیمات کی پابندی کرنے کا پورا حق اور آزادی رکھتا ہے۔ کسی انسان کو اس کے اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی مذہب کی بنیادی پر انسانوں کی تقسیم ہی کی جا سکتی ہے۔ کسی بھی مذہبی طبقے کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے طبقے کی مذہبی آزادیوں کو معطل یا ختم کرنے کی کوشش کرے۔ ہندومت میں ذات پات کے تمدنی نظام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ نچلی ذات کے ہندوؤں کو مذہبی اعتبار سے وہ مرتبہ حاصل نہیں ہے کہ جو بڑی ذاتوں سے مخصوص ہے۔ مذہبی تقدس کے حامل ذات پات کے اس نظام کے باعث نچلی ذاتوں کے ہندو آزادانہ طور پر مذہبی حقوق سے محروم ہیں۔ پریم چند نے اپنے ناول ''میدان عمل'' میں اسی انسانی حق کی نمائندگی کی ہے۔ اس ناول

میں ایک مندر کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس میں ایک ماہ سے رام راون کی کتھا جاری ہوتی ہے۔ جسے سننے کے لئے دھیرے دھیرے بھنگی اور چمار بھی آنے لگتے ہیں۔ جوتیوں کی جگہ پر آ کر بیٹھنے والے ان بھگوان بھگتوں کے باعث بقول بر ہمچاری جی دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے' نچلی ذات کے ان ہندوؤں پر جوتے برسائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شانتی کمار اور ان کے دوست آتما نند جی آڑے آتے ہیں۔ ان کا متوقف طنزیہ انداز میں پریم چند نے یوں پیش کیا ہے:

''تمہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ یہاں سیٹھ مہاجنوں کے بھگوان رہتے ہیں۔ تمہاری اتنی مجال کہ ان کے بھگوان کے مندر میں قدم رکھو۔ تمہارے بھگوان کسی جھوپڑے یا درخت کے نیچے پڑے ہوں گے۔ یہ بھگوان جواہرات کے زیور پہنتے ہیں۔ موہن بھوگ اور ملائی کھاتے ہیں۔ چیتھڑے پہننے والوں اور ستو کھانے والوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے''۔(20)

''میدان عمل'' کے سکھدا' نینا اور ڈاکٹر شانتی کمار جیسے لوگ اس ناانصافی اور انسانی حق کی پامالی پر زبردست مظاہرہ کرتے ہیں اور نچلے طبقوں کا ایک جتھا لے کر مندر پر دھاوا بولنے کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مندر کے دروازے اچھوتوں پر بھی کھل جاتے ہیں۔ ہر انسان کا یہ بھی بنیادی حق ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی نوکری یا ملازمت اختیار کرے' اس کے عوض اسے اتنا ضرور معاوضہ ملے کہ وہ ایک بہتر زندگی گزارنے کا اہل ہو سکے۔ کم از کم اجرت' تنخواہ یا معاوضے کا تعلق ایک قدرے بہتر زندگی کے حصول کے ساتھ ہوتا ہے لیکن ہندوستان کے زمینداری' مہاجنی اور جاگیرداری نظام میں کھیت پر کام کرنے والے مزدوروں کی حیثیت غلام سے زیادہ نہیں ہوتی ہے' سود پر اٹھایا گیا قرض' طرح طرح کے تاوان' ادائیگیاں' ٹیکس اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈنڈ ان کھیت مزدوروں کی زندگیوں کو تاحیات اجیرن کر کے رکھ دیتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے ناول ''گئودان'' میں ایسے ہی کھیت مزدوروں کی زندگیوں میں انسانی حقوق کی عبرتناک پامالیوں کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول کے ہوری' دھنیا' گوبر اور جھنیا سب ایسے ہی کردار ہیں کہ جو انفرادی حد تک مدافعت کے باوجود انسانی حقوق کی پامالی کے کڑے نظام کے آگے بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ یہاں غریب لوگ ہی مسائل میں گھرے ہوتے ہیں لیکن ان مسائل کا حل بھی نام نہاد پنچ اس طرح نکالتے ہیں کہ ان سب کے گھر غریبوں کی محنت سے پیدا ہونے والے غلے سے بھر جاتے ہیں۔ فصل کیا کٹتی ہے؟ مختلف قسم کی اسامیاں' مہاجن' پٹواری' زمیندار' برہمن وغیرہ سب کے سب کسان کی ساری محنت و مشقت کو اپنی جیب میں ٹھونس چلتے بنتے ہیں اور مفلوک الحال کسان خالی ہاتھ کا خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ ایک گائے خریدنے کی استطاعت اس کے پاس نہیں رہتی۔ ہوری اس ظالمانہ نظام میں رہتے ہوئے بھی ''اخلاقی قدروں'' کا ادب چاہتا ہے۔ لیکن اس کا بیٹا گوبر اس نتیجے پر پہنچتا ہے:

''جسے پیٹ کی روٹی میسر نہیں اس کے لیے آبرو اور مریادسب ڈھونگ ہے''۔(21)

نسلی' گروہی' مذہبی' لسانی اور دیگر نظریاتی تعصّبات انسانی حقوق کی پامالی کا اہم سبب ہیں۔کسی انسان' گروہ یا جماعت کو اس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ نسل' زبان یا مذہب کی بنیاد پر دوسرے انسانوں کا عرصہ حیات تنگ کر دے۔ ہر انسان کا بطور انسان احترام اور اس کے عقیدے' رنگ' نسل یا زبان کا احترام اور اس کی عزت نفس کا لحاظ بنیادی انسانی حق ہے۔کرشن چندر نے اپنے بیشتر ناولوں میں انسان کے ہاتھوں انسان کے اس انسانی حق کی پامالی کو موضوع بنایا ہے۔اس حوالے سے ان کا ناول ''پہلا پتھر'' اہمیت کا حامل ہے۔اس ناول میں کرشن چندر نے مشرق اور مغرب کے نسلی اور تہذیبی بُعد کو موضوع بنایا ہے۔نسل پرستی کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

''نسل پرستی کے جذبات کسی نہ کسی شکل میں دنیا کی ہر قوم میں موجود ہوتے ہیں۔ہر قوم اپنی خصوصیات اور کردار کو اپنی خاص نسل کی وجہ قرار دیتی ہے اور اس بنیاد پر اسے دوسری اقوام میں بڑی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔اقوام میں نسلی برتری اور کمتری کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب ان کا رشتہ فاتح اور مفتوح کا ہو جائے۔ورنہ ہر قوم اپنی ثقافت تہذیب' روایات اور اداروں کو دوسروں سے افضل سمجھتی ہے''۔ (22)

کرشن چندر کے ناول ''پہلا پتھر'' کی انگریز ماڈل گرل جولی بھی نسلی تفاخر سے معمور ہے۔اس ناول کا ایک ہندوستانی کردار ڈاکٹر کنول پرساد لندن میں ایک کامیاب پلاسٹک سرجن ہے۔یہیں اس کی ملاقات جولی سے ہوتی ہے ایک روز موقع پا کر کنول جولی کو بانہوں میں لے لیتا ہے۔اس واقعے کی بابت ایک روز وہ کنول کو صاف کہہ دیتی ہے:

''تمہیں معلوم نہیں ہے' مجھے یہ کہنا بھی نہ چاہیے مگر کیا کروں۔شاید یہ میرے خون میں ہے کہ مجھے رنگ دار لوگوں کو دیکھ کر عجیب طرح کی کراہیت کا احساس ہوتا ہے۔جب اس دن میں تمہاری بانہوں میں تھی تو جی چاہتا تھا کہ تم پر تھوک دوں''۔(23)

ایک ٹریفک حادثے میں جولی کا جسم بری طرح متاثر ہوتا ہے۔اب اس کے پاس بدصورتی اور معذوری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ڈاکٹر کنول ہمدردی اور انتقام کے ملے جلے جذبات لیے اس کی پلاسٹک سرجری کرتا ہے اور مسلسل چھ ماہ کی تگ ودو کے بعد اسے اطالوی روپ میں ترشی ہوئی مورت بنا دیتا ہے۔صرف ایک ٹانگ میں معمولی لنگ رہ جاتا ہے۔احسان مند جولی کنول کے ساتھ ہندوستان آ جاتی ہے۔کچھ عرصہ تو وہ کنول کے گھر سکون سے رہتی ہے لیکن جلد ہی وہ اس سے بے زار ہو جاتی ہے۔یہاں بھی وہ گوروں کے ساتھ اپنے تعلقات بڑھا لیتی ہے اور پھر رات

گئے تک پارٹیوں میں مصروف ہو جاتی ہے۔ایک اپریشن کے بعد اس کا معمولی لنگ بھی ختم ہو جاتا ہے۔مکمل ہوتے ہی وہ اپنے مکمل اوریجن میں چلی جاتی ہے۔لندن سے وہ ہندوستانی تہذیب کا مذاق اُڑاتے ہوئے ایک خط میں کنول کو لکھتی ہے:

''شاید تمہارا کلچر ایک لنگڑا کلچر ہے، بہت دھیرے سے آگے بڑھتا ہے یا شاید آگے ہی نہیں بڑھتا۔سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال تک ایک ہی منزل پر ٹکا رہتا ہے۔جب تک میں لنگڑی تھی۔سب ٹھیک تھا۔میں وہاں رچ اور بس گئی تھی۔مجھے کچھ برا نہیں لگتا تھا۔مگر جب تم نے دوسرا پاؤں دے دیا تو دن بدن بے چین ہوتی گئی۔لندن کی تیز رفتار زندگی مجھے اپنے قریب کھینچنے لگی''۔(24)

غرض لنگ کے باعث وہ ہندوستان کے لنگڑے کلچر میں جذب ہوگئی تھی لیکن جونہی وہ مکمل ہوئی تو وہ اپنے مکمل کلچر میں چلی گئی۔گویا یورپی کلچر ایک مکمل کلچر ہے جبکہ ہندوستانی کلچر ایک ادھورا اور لنگڑا کلچر ہے۔وہ یہاں کی گھریلو زندگی کا بھی مذاق اڑاتی ہے۔یہ باتیں جولی کی نسل پرستی پر دلالت کرتی ہیں۔وہ (ہندوستان) یہاں کے لوگوں، روایات، گھریلو زندگی، ثقافت، زبان غرض ہر چیز سے کراہت محسوس کرتی ہے۔ظاہر ہے اس کے پس منظر میں ہندوستان اور انگلستان میں موجود مفتوح اور فاتح کا تعلق ہے۔وہ اپنی قوم اور کلچر کو برتر سمجھتی ہے۔یہاں تک کہ ڈاکٹر کنول کے احسانات کو بھی یکسر فراموش کر دیتی ہے کہ جیسے یہ احسانات کوئی خدمات تھیں کہ جن کو فراہم کرنا ڈاکٹر کنول جیسے رنگ دار لوگوں کا فرض تھا۔کرشن چندر نے اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ نسلی برتری کا احساس احسانات، خدمات، علم، ہنر کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتا۔اس برتری کی بنیاد پر دوسروں انسانوں کے ساتھ جو بھی تعلق استوار ہوگا وہ انسانی حقوق کی پامالی پر منتج ہوگا۔ڈاکٹر کنول پرشاد کا عشق بھی ایک ایسا ہی المیہ ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے مخصوص سماجی، ثقافتی، مذہبی اور تہذیبی تناظر میں یہاں کی عورت کی شناخت بطور انسان ایک اہم مسئلہ ہے۔عام انسانی حقوق کا جب ذکر ہوتا ہے تو مرد اور عورت کے درمیان ان کے سماجی مقام و مرتبے کے حوالے سے ایک امتیاز قائم کیا جاتا ہے۔معاشرہ عورت اور مرد کے درمیان انسانی حقوق کے حوالے سے مختلف ترجیحات پر مبنی اقدار اور روایات کو نا صرف پیش کرتا ہے بلکہ ان کا قائل بھی ہے۔عورت کی سماجی حیثیت اور بطور انسانی شناخت کے حوالے سے جس قدر نا انصافی کو روا رکھا جاتا ہے اس کا بنیادی سبب بھی انسانی حقوق کی فراہمی میں امتیاز ہے۔قراۃ العین حیدر اپنے ناولوں میں سماج میں عورت کی شناخت کو موضوع بناتی ہیں۔ان کے ناولوں میں ''گردش رنگ چمن'' ایک ایسا ناول ہے کہ جس میں بظاہر چند طوائفوں کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں لیکن

ان کے ناول میں طوائف ایک ایسی علامت کے طور پر ابھرتی ہے کہ جو ہندوستانی سماج میں عورت کے مقام و مرتبے اور شناخت کو متعین کرتی ہے۔اس ناول کی دلنواز بیگم' ماہرو بیگم' عندلیب بیگ' عسنبر بیگ اور نواب بیگم محض طوائفیں نہیں ہیں بلکہ ان کے ذریعے مردانہ بالادستی کے حامل سماج میں عورت کے تصور کو واضح کیا گیا ہے۔دلنواز بیگم اور ماہر و بیگم کا قصور صرف اتنا ہے کہ ان کے والد مرزا عثمان بیگ مجاہدین کے ساتھ سرائے طغرل خان میں لڑتے ہوئے کام آ گئے۔دونوں بچیاں ایک دلال فتح محمد کے ہاتھ لگ جاتی ہیں جو انہیں ناچ گانے میں طاق کر دیتا ہے۔دلنواز کا نکاح سہراب نگر کے بوڑھے نواب سے طے پاتا ہے لیکن شادی سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔نکاح کی تیسری شرط میں فتح محمد نے خود کو دلنواز کا ماموں بتایا تھا۔وہ خط لکھ کر نواب کو بھجواتی ہے کہ وہ مرزا عثمان بیگ کی بیٹی ہے کسی بھڑوے کی اولاد نہیں لیکن یہ خط پہنچنے سے پہلے ہی نواب انتقال کر جاتا ہے۔نواب کے مرنے سے زیادہ اپنی اصل شناخت کے نواب تک نہ پہنچنے کا دلنواز کو بہت صدمہ ہوتا ہے کہ نواب اس کی حیثیت کے بارے میں غلط تاثر لے کر مرا۔رضائی میں آگ لگنے سے اس کا چہرہ جھلس جاتا ہے۔ایک پیر کے کہنے پر ایک مرید سے شادی کر کے حج بھی کر آتی ہے وہیں اس کا شوہر مر جاتا ہے۔واپسی پر چھوٹی بہن مہرو کے پاس آتی ہے کہ وہ یہ غلط دھندہ چھوڑ دے وہ غربت اور فاقہ کشی کے خوف سے ایسا کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔وہ خود ایک پنجابی تاجر کے گھر لونڈیوں کو قرآن پڑھانے پر مامور ہو جاتی ہے۔یہیں نواب فاطمہ گھر کی ملازمہ ہے جو عطر کے بڑے تاجر کی بیٹی تھی۔مرتے وقت بچی کی کفالت کے لئے سارے اثاثے روپے پیسے اپنے ایک دوست تاجر کو دے جاتے ہیں کہ دوست ہے خیال رکھے گا مگر وہ تاجر سارا مال غصب کر کے بچی کو گھر کی نوکرانی بنا دیتا ہے۔مہرو دلنواز کے لیے ڈولی بھجواتی ہے۔آنکھ مچولی کھیلتی نواب غلطی سے اس میں بیٹھ جاتی ہے کہار سیدھا اٹھا مہرو کے کوٹھے لے آتا ہے۔نواب وہیں رات بسر کرتی ہے۔دلنواز کی حقیقت کھل جاتی ہے اور ساتھ ہی اس خطا پر نواب کو بھی گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔اجمیر شریف بذریعہ ٹرین پہنچتی ہے اور راحت بائی اجمیر والی کے ہاتھ لگتی ہے وہ اسے اپنی خالہ زاد بہن کے ہاں جے پور بھجوا دیتی ہے۔جہاں چند ہی ماہ میں نواب کا فن اور حسن نکھر جاتا ہے۔ٹھاکر مہیشور سنگھ کے کھلے مجرے کی ملازمہ بن جاتی ہے۔یہیں فوٹو گرافر موسیو رینال جو بیلجم کا باشندہ تھا ٹھاکر کے عنایت کردہ مغل زیورات سے لدی نواب کی تصویر بناتا ہے۔اسی موسیو رینال سے عندلیب بانو پیدا ہوتی ہے۔دوسری جنگ عظیم کے دوران رینال بھاگ جاتا ہے۔مہیشور کے دیہانت کے بعد نواب کلکتہ آ جاتی ہے۔

کلکتہ کے ایک کاروباری امبا پرشاد کی ملازمت میں آ جاتی ہے جو احقر تخلص کرتے تھے۔عندلیب کا ٹیوٹر سید

شکور حسین جو الہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا' امبا پرشاد کی اجازت سے اس سے شادی کر لیتا ہے اور عندلیب جو ابھی انٹرنس ہی کر رہی ہوتی ہے سید شکور حسین کے غلیظ گھر میں دن بتانے لگتی ہے۔ براؤن آنکھوں اور سنہری بالوں والی یوریشین عندلیب تو سید شکور حسین کے لئے قابل قبول ہوتی ہے۔لیکن جب اس کے ہاں بچی جنم لیتی ہے تو محمڈن ٹیچر اسے طلاق تھما دیتا ہے کہ اس کنجنی کی جنی سے کون شادی کرے گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ بچی امبا پرشاد کی تھی نہ کہ شکور حسین کی۔طوائف بنت طوائف کو تو قبول کر لیا جاتا ہے لیکن شکور امبا پرشاد سے جنم لینے والی بچی کو قبول نہیں کرتا۔امبا پرشاد نے بھی گلوخلاصی کے لئے بیاہ میں اسی لئے رکاوٹ نہ ڈالی تھی۔اس بات کا علم جب بڑی ہو کر مس عنبرین شکور کو ہوتا ہے تو یہ بات اسے مزید شناخت کے بحران سے دوچار کر دیتی کہ وہ مس شکور نہیں تھی دراصل مس امبا پرشاد تھی۔مما عندلیب تردید بھی کرتی ہے لیکن اب یہ تردید اس کے نفسیاتی عارضے کا حل نہ رہی تھی۔ دوسری طرف اخلاقی حالت یہ ہے کہ نواب بیگم کا کیمیو چور بازار سے خرید کر ایک تاجر گھرانہ اپنا نوابی پس منظر ظاہر کرنے کے لئے نواب بیگم ویشیا کو اپنی دادی قرار دیتا ہے۔عندلیب اور عنبرین کے مشترکہ دوست ڈاکٹر منصور کو بھی جب دلنواز' مہر' عندلیب اور عنبرین کی داستان کا پورا علم ہو جاتا ہے تو وہ بھی سوچنے لگتا ہے:

''بے چاری مسز بیگ کے لئے ایک نامعلوم طریقے سے میرے رویے میں فرق آ گیا ہے پہلے میں اپنی ماں یا خالہ یا کسی اور بزرگ عزیزہ کی طرح ان کا بہت احترام کرتا تھا۔اب وہ بات کیوں نہیں رہی؟''(25)

غرض فتح محمد دلال سے لے کر ڈاکٹر منصور تک تمام مردوں کا رویہ تھوڑے بہت فرق سے عورت کے لئے ایک ہی جیسا ہے۔ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ جو عورت کے انسانی حقوق کو اس کے انسان ہونے کے ناطے فراہم کرنے میں دل چسپی رکھتا ہو۔سب اسے طوائف ہی کے روپ میں دیکھتے ہیں۔حالات کی ستم ظریفیاں ان عورتوں کو طوائف بنا دیتی ہیں۔کیونکہ معاشرہ عورت کے لئے انسانی حقوق کی فراہمی کے لئے آمادہ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ طوائف کے لئے بطور انسان اسے عزتِ نفس فراہم کرنا' اسے بہتر زندگی کا حق مہیا کرنا اور اس کے احترام و وقار کے لئے عملی انتظام کرنا اور اقدام اٹھانا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔جس معاشرہ میں عزت' وقار' حسب نسب' اقدار اور تہذیب کے نام پر عام عورتوں کو مساوی انسانی درجہ دینے کی روایت نہ ہو' جہاں ایک عام عورت کے حقوق کو اقدار اور تہذیب کے نام پر سلب کیا جاتا ہو اس معاشرے کا اجتماعی لاشعور طوائف کے لئے کیا کیا نہ تحفظات رکھتا ہو گا۔نواب بیگم' دلنواز بیگم' ماہرو بیگم' عندلیب بیگ' اور عنبرین بیگ کا المیہ بھی یہی اجتماعی لاشعور ہے۔

انیس ناگی نے اپنے ناول ''دیوار کے پیچھے'' میں ایک ایسی ریاست کا نقشہ کھینچا ہے کہ جہاں ظلم' ناانصافی'

نراج اور محکومی کا دور دورہ ہے۔ جن ریاستوں میں انسانی حقوق کا تحفظ نہ کیا جاتا ہو وہاں معاشرتی اور ریاستی سطح پر سوائے ظلم کے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ ریاست انسانی حقوق کی ترجمانی کے خواہ کتنے ہی بڑے دعوے کیوں نہ کرے اگر ریاستی قوانین اور ادارے ہی انسانی حقوق کے مسائل پیدا کرنے کا موجب بن جائیں تو قومی سطح پر انسانی حقوق کا تحفظ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ انسانی حقوق کا تحفظ صرف اسی صورت ممکن ہے جب ان حقوق کو معاشرے تک پہنچانے کے لیے ٹھوس اقدامات کیے جائیں۔ پس بقول خیال امروھوی:

''وہ قومیں جو انسانی بنیادی حقوق اور بنیادی ضروریات کی بنیاد پر نظریے یا نظام حیات کی عمارت استوار کر لیتی ہیں وہ کم از کم ان نظامات سے بہتر ہوتی ہیں جن میں تصوریت' بے عملی اور غیر سائنسی افکار کی کارفرمائی ہوتی ہے''۔(26)

''دیوار کے پیچھے'' ایک ایسی ریاست ہے کہ جہاں ظلم' بے روزگاری' تنہائی' بے بسی' بے زاری اور ابن الوقتی کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ذاتی اغراض کے حصول کے لئے لوگ کمینے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں' جہاں تھانوں میں ظلم ہوتا ہے جھوٹی گواہیاں ڈالی جاتی ہیں اور کچہریاں ٹاؤٹوں' اُجرتی گواہوں اور قانون کے دلالوں سے بھری رہتی ہیں۔ اس ناول کے مرکزی کردار کا المیہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف اس تمام سیاسی' سماجی' ریاستی اور تمدنی بگاڑ کی خبر رکھتا ہے بلکہ اس کے تدارک کے لئے ایک خاص نکتہ نظر بھی رکھتا ہے۔ یہ ایک پروفیسر ہے چنانچہ اس کے اسی خاص نظریے کی پاداش میں اسے نا صرف کالج کا پرنسپل کالج سے نکال دیتا ہے بلکہ سرکاری ایجنسیوں کے لوگ مسلسل اس کے تعاقب میں رہتے ہیں اور اس کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے شاگرد بھی اسے ''سرخا سرخا'' کہہ کر بھاگ جاتے ہیں۔ محض ایک ایسا نظریہ رکھنے کی وجہ سے کہ جسے ریاست کی سیاسی حکمت عملی اپنے خلاف سمجھتی ہے' پروفیسر کو شاہی قلعے کے عقوبت خانے تک پہنچا دیا جاتا ہے اور اس پر بہیمانہ تشدد کیا جاتا ہے۔ اس کے ناکردہ گناہ کا تفتیش کرنے والوں کو ظاہر ہے کہ کوئی ثبوت بھی نہیں ملتا۔ یہ اس کا انسانی حقوق کا شعور ہی ہے کہ جس نے اسے اس حال تک پہنچایا۔ حالانکہ ریاستی تقاضوں کے پیش نظر ''مفید شہری'' بن کر رہنا دیگر لوگوں کی طرح اس کے لئے مشکل نہ ہوتا وہ کہتا ہے:

''یہی شعور ہی میرا عذاب ہے' جس سے میں نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ اِس ہزار پایہ عفریت نے میرے جسم و جان کو جکڑ لیا ہے''۔(27)

غرض اس ناول میں انیس ناگی نے انسانی حقوق کی پامالی کو اپنی اور اپنے عہد کی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ محض ایک فرد کے سوچنے یا ایک فرد کی جدوجہد سے معاشرہ انسانی حقوق کے حصول میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہ

اجتماعی مفادات کی اجتماعی تحریک کا نام ہے۔ جب تک معاشرے کے تمام افراد انسانی حقوق کے حصول کے لئے مل کر جدوجہد نہیں کر سکتے اس وقت تک معاشرے میں ظلم' ناانصافی اور انسانی حقوق کی پامالی کا دور دورہ رہتا ہے۔ ہر انسان کا یہ بھی بنیادی حق ہے کہ وہ کوئی بھی سیاسی' معاشی یا کوئی بھی نظریہ رکھ سکتا ہے' وہ اسے دوسروں کے سامنے پیش بھی کر سکتا ہے۔ جن معاشروں میں اس بات کو ریاستی سطح پر انسانی حق کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا وہاں پروفیسر جیسے باشعور لوگ حالات کی سنگینیوں کا شکار ہو کر داستان پارینہ بن جاتے ہیں اور زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔

پاکستان دراصل ایک ایسی تحریک کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا کہ جس کی روح میں انسانی حقوق کا گہرا دراک شامل تھا۔ پاکستان سے مراد ایک ایسے خطہ زمین کا حصول تھا کہ جس میں لوگ بغیر کسی رکاوٹ' خوف یا دہشت کے آزادانہ طور پر اپنی سیاسی' سماجی' تہذیبی' مذہبی' ثقافتی اور معاشی سرگرمیوں اور حقوق کا تحفظ کر سکیں گے۔ پاکستان کی اگر کوئی نظریاتی اساس ہے تو وہ انہی انسانی حقوق کے تحفظ کا احاطہ کرتی ہے۔ پاکستان کی بنیاد کے حوالے سے قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی تقاریر اور علامہ اقبالؒ کے خطبہ الہ آباد کی روشنی میں ایک ایسا ہی پاکستان سامنے آتا ہے کہ جو رنگ' نسل' زبان' عقیدے اور علاقائیت کی تمیز کے بغیر پاکستانی قوم کے جملہ حقوق کا ترجمان ہوگا۔ لیکن نوزائیدہ پاکستان میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے عوامی امنگوں کی ترجمان کوئی بھی مئوثر حکمت عملی طے نہ ہو سکی۔ ملک ابتدائی پچیس سال تک نیم سیاسی حکومتوں اور ایک طویل مارشل لاء کے زیر سایہ رہا' آمرانہ حکومتوں میں چونکہ بنیادی انسانی حقوق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے عرصہ میں قوم کو انسانی حقوق کا ترجمان کوئی جمہوری آئین بھی نہ مل سکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک دولخت ہو گیا اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ چنانچہ جو سلسلہ جعلی کلیموں کے کاوربار سے شروع ہوا ریاستی ترجیحات کے تحت وہ سلسلہ ملک کے طول وعرض میں پھیلے جاگیردارانہ نظام' پرمٹ اور کوٹہ سسٹم' عہد غلامی کی باقیات کی حامل سول وملٹری بیوروکریسی' ضیاء الحق کے ملکی تاریخ کے دوسرے طویل مارشل لاء سے لے کر جنرل پرویز مشرف کے تیسرے مارشل لاء تک جاری وساری ہے۔ اس نصف صدی کے قصے میں صرف آمریت کو استحکام ملا اور انسانی حقوق کا تصور کمزور ہوتے ہوتے قوم کی اجتماعی سائیکی سے ہی نکل گیا۔ انسانی حقوق کی اس قدر بے حرمتی پر اردو ناول نوحہ کناں ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ناولوں میں ایک ایسے ہی پاکستان کی منظر کشی ہے۔

انتظار حسین کے ناول ''بستی'' میں ذاکر' سلامت' اجمل' افضال اور عرفان ایسے کردار ہیں جو نئے پاکستان کو ایسی بستی کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں جہاں لوٹ مار اور ناانصافی کی بجائے امن' محبت' رواداری' ترقی اور خوشحالی

ہو جو امریکہ اور سامراجیوں کی حکمت عملیوں پر کاربند ہونے کی بجائے اپنی عوام دوست ترجیحات پر عمل پیرا ہو۔لیکن اس بستی میں ہر طرف احتجاج' اینٹیں' پتھر' توڑ پھوڑ' لڑائی جھگڑے' خون ریزیاں' جلسے جلوس ہنگامے دکھائی دیتے ہیں۔حق' انصاف' عدل اور ترقی وخوشحالی کے خواب دیکھنے والے اس بستی میں پہنچ کر حواس باختہ ہو جاتے ہیں' انہیں کوئی راہِ نجات دکھائی نہیں دیتی' ان کے رستے ناسوروں پر مرہم رکھنے والا کوئی نہیں اور نہ ہی کوئی ان کے احتجاج پر کان دھرتا ہے۔انسانی حقوق کی اس پامالی پر ناول کے مرکزی کردار ذاکر کے لئے سرحد کے اس پار بہت دور رہ جانے والی ''روپ نگر'' کی بستی جو اس کے خوابوں اور امیدوں کی بستی ''پاکستان'' سے زیادہ آئیڈیل نہ تھی بڑی بامعنی ہو جاتی ہے۔اپنے دوست سریندر کے نام ایک خط میں کہتا ہے:

''یار کتنی عجیب بات ہے کہ وہی ایک بستی اپنے ایک باسی کے لئے کہ ہجرت کر گیا ہے پہلے سے بڑھ کر بامعنی ہو گئی کہ وہ اسے خوابوں میں دیکھتا ہے اور دوسرے کے لئے اس کے سارے معنی جاتے رہے کہ وہ اسی دیس میں ہے مگر کبھی اس کے یہاں اس بستی کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو پیدا نہیں ہوتی۔ہجرت نے روپ نگر کو کتنا بامعنی بنا دیا ہے''۔(28)

کوئی بھی آزاد ملک اپنے باشندوں کے لئے ایک گھر کی حیثیت رکھتا ہے۔اس گھر کی بہت بڑی چھت تلے در و دیوار کے اندر اس گھر کے باسی امن ومحبت' خوشحالی' باہمی احترام اور عزتِ نفس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔غرض کوئی بھی آزاد ملک اپنے تمام شہریوں کے لئے انسانی حقوق کی فراہمی اور تحفظ کا علمبردار ہوتا ہے۔اگر ایسا نہ ہو تو اس گھر کی بنیادوں میں پائی جانے والی خامیاں دھیرے دھیرے ساری عمارت میں دراڑیں ڈال دیتی ہیں۔انتظار حسین کے ناول ''تذکرہ'' کا ''آشیانہ'' اپنے وسیع تر معنوں میں ایک ایسے ہی گھر کی علامت ہے۔اس ناول کے مرکزی کردار اخلاق کے اجداد کا ''گلستان محل'' اور ''چراغ حویلی'' کئی پُشتوں سے اس کے خاندان کے لئے امن ومحبت اور حفاظت کا گہوارہ تھے۔گلستان محل جو مضبوط بنیادوں پر استوار تھا جب اجڑتا ہے نئی پائیدار بنیادوں پر چراغ حویلی تعمیر ہو جاتی ہے۔ان گھروں کے خاندانی طبیبوں میں کوئی انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے پر دستخط کرنے کے باعث پھانسی چڑھتا ہے' کوئی انگریزوں کا مداح ہے تو کوئی خلافت تحریک کا حامی لیکن ان گھروں کی چھتیں سب کو تحفظ فراہم کرتی ہیں۔پاکستان بنتا ہے تو اخلاق بھی اپنے والدین کے ساتھ یہاں آ جاتا ہے۔اخلاق کوئی مکان الاٹ نہیں کرواتا بلکہ الاٹ شدہ مکانوں میں کرائے پر دھکے کھاتا کھاتا ایک ٹکڑا زمین خرید کر اور ادھر ادھر سے قرضہ پکڑ کر اپنا ''آشیانہ'' بنا لیتا ہے۔آشیانے کے ''مقروض'' باسی اخلاق کی قرضدار بہت جلد بوٹیاں نوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ملازمت بھی اس کی اچھی ہوتی ہے لیکن اوپر کی آمدنی کے بغیر آشیانے کا تحفظ نا

ممکن ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے ''آشیانہ'' بیچ دینے کی نوبت آ جاتی ہے۔ گلستان محل اور چراغ حویلی کے مقابلے میں ''آشیانہ'' بہت کمزور ثابت ہوتا ہے۔ شہر میں جب دھماکے شروع ہوتے ہیں تو کوئی عمارت' کوئی گلی' کوئی محلّہ' محفوظ نہیں رہتا۔ خوف و ہراس اور تباہی و بربادی کے اس منظر نامے میں آشیانہ بھلا کہاں محفوظ رہ سکتا تھا۔ چاروں کھونٹ اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ اس اندھیرے میں امن' تحفظ اور آزادی کے تمام انسانی حقوق گم ہو جاتے ہیں۔ اخلاق کو سمجھ نہیں آتا کہ وہ اپنی اس بے بسی' عدمِ تحفظ اور اپنی دم توڑتی ہوئی ذات سے متعلق اجداد کی میراث کے مقابلے میں پرکھوں کے ''تذکرے'' میں کیا لکھے؟ انجام کار وہ سوچتا ہے:

''کب تک ان کالے پانیوں میں چلیں گے کب تک۔ اس کالی لمبی رات کا کوئی انت ہے کہ نہیں۔ اُجالا اور کنارہ کہیں ہے کہ نہیں''(29)

امن عامہ کے مسائل پر قابو پانا یا ان کی وجوہات کا سدباب کرنا اور شہریوں کو تحفظ فراہم کرنا ریاست کا بنیادی فرض اور شہریوں کا انسانی حق ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ناول ''آگے سمندر ہے'' میں اسی انسانی حق کی پامالی کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول کا ایک کردار جواد تقسیم کے بعد خوفناک قتل و غارت گری اور خوف و ہراس کی وادی سے گزر کر پاکستان آ جاتا ہے اور کراچی میں بس جاتا ہے۔ لیکن یہ سرزمین جس کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہاں کوئی گولی کی بات نہیں ہوگی اور نہ ہی کسی کے ہاتھ میں بندوق ہوگی' اس کے خوابوں کے برعکس ثابت ہوتی ہے۔ بہت جلد قتل' اغوا' ڈاکے' بم دھماکے اور بھرے بازاروں میں معصوم شہریوں پر گولیاں برسنا شروع ہو جاتی ہیں۔ جب شہری آزادیوں اور انسانی حقوق کو غصب کر لیا جاتا ہے تو ان حالات میں نسلی' قومیتی' علاقائی اور لسانی تعصّبات کو خوب ہوا ملتی ہے۔ کراچی بھی اسی ہوا کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ ان حالات کا کیا نتیجہ نکلا اور کیا صورتحال بنی اور جواد کے لئے کراچی کیا تھا؟ وہ کہتا ہے:

''اخبار میں کون سی ایسی خبر تھی کہ اس میں غرق رہتا۔ وہی معمول کی خبریں ڈاکے' قتل' اغوا' گینگ ریپ' فلاں علاقہ میں موٹر چھین لی گئی۔ فلاں بنک پر کلاشنکوف برداروں کے ایک ٹولے نے دھاوا بولا' مزاحمت کرنے والے چوکیدار کو گولی ماری اور چالیس لاکھ کی رقم لے کر فرار ہو گئے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ڈاکوؤں کی گرفتاری کا حکم۔ فلاں شاہراہ سے فلاں صنعت کار کا اغوا' پچاس لاکھ تاوان کا مطالبہ وغیرہ وغیرہ''۔(30)

عدمِ تحفظ' انسانی حقوق کی پامالی اور امن عامہ کی بگڑتی ہوئی صوتحال کے پیش نظر ہر طرف خوف راج کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک روز جواد جب ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوتا ہے ایک کار گزرتی ہے اور کار میں بیٹھے دھشت گرد سر

عام کلاشنکوفوں کا کھلا منہ ہوٹل کی طرف کر دیتے ہیں' جواد بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اسی حالت میں لاشعور کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ اسی حالت میں غرناطہ کی گلیوں میں گھومتا ہندوستان آتا ہے' پھر آگ کا دریا عبور کر کے پاکستان آتا ہے لیکن اس سے آگے سمندر دکھائی دیتا ہے اور مراجعت بھی ناممکن۔ اب جائے تو کس جائے پناہ کی طرف۔ غرض انتظار حسین نے اپنے ناولوں میں پاکستان میں انسانی حقوق کی دگرگوں حالت کو موضوع بنا کر ایک حساس فنکار کی طرح اپنے ناولوں میں انسانی حقوق کے شعور کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول ''نادار لوگ'' اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ اس میں پاکستان کی تاریخی جبریت میں پسنے والے لوگوں کے انسانی حقوق کی مسلسل پامالی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول کے دونوں مرکزی کرداروں ملک اعجاز حسین اور سرفراز کا شمار نادار لوگوں میں نہیں ہوتا بلکہ نادار لوگ وہ ہیں کہ جو اپنی توہین آمیز زندگیوں کو بدل دینے کی تڑپ رکھنے کی بجائے اپنی ذلت اور بربادی کے خود تماشائی بنے رہتے ہیں۔ ملک اعجاز ایک سکول ماسٹر ہے جو بھٹہ مزدوروں کے ساتھ روا رکھے جانے والے غلامانہ سلوک کے خلاف عملی احتجاج سے مزدور یونینوں میں سرگرم کارکن بن کر اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ ''پیشگی'' کے بہانے نسل در نسل گلنے سڑنے والے بھٹہ مزدوروں کی حالتِ زار کو بدل دینے کی کوششوں کے نتیجے میں اعجاز کے خلاف نیچے سے اوپر تک ساری ریاستی مشینری سرگرم ہو جاتی ہے۔ مزدور یونینوں میں حصہ لینے کی پاداش میں اس سے سکول ہیڈ ماسٹرز بردستی استعفیٰ لکھوا کر گھر بھیج دیتا ہے کیونکہ دوسری صورت میں اسے جیل کی ہوا کھانا پڑتی۔ علاقے کے بڑے زمیندار ملک جہانگیر اعوان کی شوگر مل کے مزدوروں کے مسائل حل کرنے کے لئے مزدوروں کا ساتھ دینے کی بجائے ملک جہانگیر کا ساتھ دینے سے انکار کرتا ہے تو اس کے کھڑے کھیتوں پر انتقاماً ملک جہانگیر ٹریکٹر پھروا دیتا ہے۔ ایک نئی عوامی پارٹی میں جب پورے خلوص کے ساتھ اس پارٹی کے عوامی لیڈر کے سیاسی پروگرام کا مکمل ساتھ دیتا ہے اور مزدور تنظیموں کو متحدہ اور متحرک کرتا ہے لیکن جب اس پارٹی کی حکومت بنتی ہے تو ''ہائی کمان'' اسے یونین کے دفتر سے نکال دیتی ہے۔ اپنی صحافتی زندگی میں جب ایک ڈرامائی وقوعے کے باعث ''حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ'' اس کے ہاتھ لگتی ہے کہ جس میں مشرقی پاکستان کے سانحہ کے سلسلہ میں بعض جرنیلوں کے خلاف مقدمے چلانے اور سزا دینے کی تجویز دی گئی ہوتی ہے' تو کسی ایجنسی کے لوگ سات روز تک ایک عقوبت خانے میں اس پر شدید ذہنی اور جسمانی تشدد کرتے ہیں۔ دوسری طرف اس کا بھائی سرفراز ہے جو فوج میں میجر ہوتا ہے۔ جس یونٹ کو بلوچستان میں مری قبائل کی بغاوت کو کچلنے کے لئے بھیجا جاتا ہے' اس میں سرفراز بھی شامل ہوتا۔ کاروائی کے دوران قبیلے کے بوڑھے سردار کو گرفتار کرنے کی بجائے جب گولی سے مار

دیا جاتا ہے تو جوابی فائرنگ میں تین سپاہی بھی مر جاتے ہیں۔ سرفراز کرنل سے اختلاف کرتا ہے کہ اگر سردار کو مارنے کی بجائے گرفتار کر لیا جاتا تو تین سپاہی بھی نہ مرتے لیکن کرنل اسے سٹریٹیجک کیلکولیشن قرار دیتا ہے۔ اس بات پر غصے میں آ کر کرنل کا گریبان پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے:

''تم اپنے ہی لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو''۔(31)

سرفراز کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور انکوائری کے دوران اسے انڈیا کا ایجنٹ' اپنے بھائی اعجاز کو کمیشن کی رپوٹ فراہم کرنے والا اور ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوّث ہونے جیسے الزامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے ھتک آمیز تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ بعد میں میجر کارینک بحال کر کے فوج سے جبری ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔

اس ناول میں ملک اعجاز اور سرفراز کے کرداروں کو عبداللہ حسین نے پاکستان کے مجبور و مقہور نادار لوگوں کے انسانی حقوق کے ترجمان کے طور پر پیش کیا ہے جو اپنی اپنی سطح پر لڑائی لڑتے ہیں لیکن جن نادار لوگوں کے انسانی حقوق کے لئے وہ لڑ رہے ہیں وہ لوگ حالات کی شکست و ریخت کے باعث بے حسی' مجبوری اور لاچاری کی آخری دیوار سے لگ چکے ہیں۔ ان کا قومی یا اجتماعی شعور بے بسی کی اس زندگی کو مقدر کا لکھا سمجھ کر اس زندگی سے سمجھوتہ کر چکا ہے۔ انسانی حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری چند افراد پر نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک قومی اور اجتماعی ذمہ داری ہوتی ہے۔ قومی اور اجتماعی جدوجہد ہی ریاست اور ریاستی اداروں کے مخصوص نظام کو اس بات پر مجبور کر سکتی ہے کہ ایک آزاد انسانی معاشرے میں انسانوں کو ان کے حقوق سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ معاشرے میں انسانی حقوق کی مسلسل پامالی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پوری قوم نادار لوگوں کا ایک انبوہ بن جاتی ہے۔ نادار لوگوں کے اسی المیے کو عبداللہ حسین نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے۔

مذہبی آزادی ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ انسانی حقوق کی دستاویزات میں اس انسانی حق کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اپنی معاشرتی زندگی میں ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو بھی مذہب یا عقیدہ اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اسے کھلے بندوں یا محدود سطح پر اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ' ان پر کاربند ہونے اور یا عبادات کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس انسانی حق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مذہبی انتہا پسندی کے رجحانات کی تلافی ہو سکے۔ جب اس حق کو ریاستی سطح پر پذیرائی نہیں ملتی اور اس کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے قانونی طور پر اقدامات سے گریز کیا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں مذہبی تعصّبات کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور متشدد مذہبی سیاست اپنے کل پرزے نکال لیتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے ناول ''راکھ'' میں انسانی حقوق کی پامالی کے اسی المیے کو موضوع بناتا ہے۔ یہ ناول ایک ایسے

معاشرے کی تصویر کو پیش کرتا ہے کہ جہاں مذہبی انتہا پسندی کی لہر قیام پاکستان کے بعد ہندوؤں کے تجارتی مرکز شاہ عالمی لاہور کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ آگ لگانے والوں کو یہ معجزہ تو دکھائی دیتا ہے کہ اس علاقے کی لال مسجد شعلوں سے محفوظ رہی لیکن شاہ عالمی چوک کے سنہری کلس والے مندر کے آگ سے بچ رہنے پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ پاکستان کو اپنا گھر کہنے والے ایک کوچوان بندو رام کو بے دردی سے قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہاں فن تعمیر کی شاہکار ایک قدیم عمارت ''لال حویلی'' کو کنجری کی حویلی پکارا جاتا ہے اور قدیم نوادرات کو کوٹ کر دیواروں پر سفیدی کا کام لیا جاتا ہے۔ کرسمس کی خوشیاں منانے والے کچی آبادی کے مکینوں کے لئے خوشی اور سماجی مقام کیا ہے:

''کرسمس کا اختتام نہیں ہوا تھا لیکن ان دیکھے جھاڑوؤں پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی تھی کہ یہی اخیر تھا.....عیسائی یا مصلّی.....یہی اخیر تھا''۔(32)

اس ناول میں ایک کردار کویتی نژاد فاطمہ کا بھی ذکر ہے۔ جو ایک ہندو بابو پٹیل سے محبت کے باعث ہندو رسوم کے مطابق اس سے شادی رچا لیتی ہے۔ فاطمہ جس کے اپنے بقول اس نے ایک جائز تعلق استوار کیا تھا کے دونوں بیٹے شیوسینا کے ''ڈائی ہارڈ'' ممبر ہیں اور بابری مسجد کے خلاف چلنے والی تحریک میں پیش پیش رہتے ہیں انہیں ان بات کا شدید قلق ہے کہ ان کے ہندو خون میں مسلمان عورت کے خون کی آمیزش ہے۔ حالانکہ فاطمہ ہندومت کو تسلیم کر چکی ہوتی ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ انسان اپنے فیصلوں میں آزاد نہیں ہے وہ مذہب' وطن اور اخلاق کی قید میں ہے اور محبت بھی انسان کو اس قید سے رہائی نہیں دلا پاتی۔ ادھر لاہور میں بھی بابری مسجد کی شہادت کے خلاف شدید ردعمل ہوتا ہے اور ایک تاریخی مندر کو گرا دیا جاتا ہے۔ اُدھر جہاد افغانستان جاری ہوتا ہے اور ادھر ملک کا ایک بڑا شہر کراچی مختلف النوع تعصّبات کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ ہر طرف ناکے' پوچھ گوچھ' تفتیش اور جامہ تلاشی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ کراچی' عروس البلاد' بارود کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ ہر طرف کسی ان دیکھی سنسناتی ہوئی آتی گولی کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ کسی کی جان محفوظ نہیں تمام شہری زندگی کے حق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس ناول کی ایک کردار شوبھا جب اپنے چاچا اور بابا کے ساتھ چولستان کے ویرانے میں جاتی ہے تو وہ انسانی حقوق سے محروم بھرے پرے شہروں سے دور اس صحرا میں حیران رہ جاتی ہے کہتی ہے:

''نو شوٹنگ۔۔نو سڑے بلٹ۔۔نو بومب بلاسٹس اور نو ایم کیو ایم اور نو پنجابی پختون اتحاد.....میں کس دنیا میں آ گئی ہوں چاچا مشاہد''۔(33)

شوبھا کا باپ مردان بھی ایک سڑے بلٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ غرض اس ناول میں مستنصر نے مختلف

تعصّبات کی بنیاد پر پیدا ہونے والے انسانی حقوق کے مسائل کو گہرے انسان دوست شعور کے ساتھ پیش کیا ہے اور انسانی عظمت اور وقار کو انسانی حقوق کے تحفظ کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ مستنصر اپنے اس ناول میں انسان دوست اقدار کا احیاء چاہتے ہیں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک مذہب، عقائد، نسل اور قومیت کی بنیاد پر ہونے والی انسانی حقوق کی پامالی کو ختم نہیں کر دیا جاتا۔

اُردو ناول نگاری کی تاریخ کا مطالعہ اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ اُردو ناول نے ہر عہد میں انسانی حقوق کے تحفظ کی بات کی ہے۔ انسانی حقوق کے شعور کو فروغ دینے میں اردو ناول نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو ناول کی خوبی یہی رہی ہے کہ اس نے معاشرے کی غیر انسان دوست روایات اور اقدار سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا اور نہ ہی انسانی حقوق کی پامالی پر خاموش تماشائی بنا ہے۔ اردو ناول ہر سطح پر انسانی حقوق کا نہ صرف یہ کہ علمبردار بنتا ہے بلکہ ہر عہد میں انسانی حقوق کی پامالی پر سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اپنی کتاب ''اُردو ناول نگاری'' میں ناول کی فنی اور فکری خصوصات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ناول میں زندگیوں کے مرقعے پیش کیے جاتے ہیں۔ حقیقی و واقعی۔ موضوع کے اعتبار سے اس کا میدان عمل بہت وسیع ہے اتنا ہی وسیع جتنی خود زندگی۔۔۔ اس کا مطمح نظر ''ادب برائے زندگی'' اس کا موضوع ''انسان'' اور اس کا نظریہ ''فروغ انسانیت'' ہے۔
>
> (34)

ناول کی ان بنیادی، خصوصیات اور اہمیت کی روشنی میں جب اردو ناول نگاری کے ارتقاء سے جائزہ لیا جاتا ہے تو اُردو ناول پر بھی سہیل بخاری کی رائے پوری پوری صادق آتی ہے۔ اردو ناول کا مطمح نظر بھی ''ادب برائے زندگی'' اس کا موضوع صرف اور صرف ''انسان'' ہے اور اس کا نظریہ ''فروغ انسانیت'' ہے۔

حواشی

(1) اقوامِ متحدہ، انسانی حقوق کا عالمی منشور، ترجمہ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق، لاہور

(2) آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان، تعارف وتشریح، زاہد حسین انجم، لاہور، منصور بک ہاؤس 1997ء ص 13

(3) PAUL KURTZ FORBIDDEN FRUIT: THE ETHICS OF HUMANISM, New York, Promitheus books, 1998, P.85 to 194

(4) Editor, Lewis Vaughn, Free Inquiry, NEW YORK, 1999, P. 12to14

(5) آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان، تعارف وتشریح، زاہد حسین انجم، لاہور، منصور بک ہاؤس 1997ء ص 15

(6) ولیم او ڈگلس، بنیادی انسانی حقوق کا مسئلہ لاہور مکتبہ میری لائبریری 1965ء ص 35

(7) جمیل جالبی، تنقید اور تجربہ، لاہور، یونیورسل بکس 1988ء: ص 65

(8) Corliss Lamont, the phylosophy of Humanism New York, The Continum Publishing com, 1993, P. 275

(9) اقوامِ متحدہ، انسانی حقوق کا عالمی منشور، ترجمہ پاکستان: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق، لاہور

(10) شمع افروز زیدی، ڈاکٹر، اُردو ناول میں طنز و مزاح، دہلی، اُردو اکادمی 1987ء، ص 25

(11) نگہت سلیم (مدیر) ادبیات، اسلام آباد، شمارہ 54 '2001ء، ص: 141

(12) علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، لاہور، لاہور اکیڈمی، 1964ء، ص 202

(13) سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1984ء، ص 191

(14) نذیر احمد، بنات النعش، لاہور، ادارہ فروغ ادب و سائنس، 1986ء، ص 191

(15) ایضاً، ص 26

(16) نذیر احمد، ابن الوقت، لاہور، ادارہ فروغ ادب و سائنس، 1987ء: ص 211

(17) راشد الخیری، شامِ زندگی، کراچی، عصمت بکڈ پو، 1963ء، ص 79

(18) مرزا ھادی رسوا، امراؤ جان ادا، لاہور، مقبول اکیڈمی، سن ندارد: ص 245

(19) پریم چند، نرملا، لاہور، چوھدری اکیڈمی، سن ندارد: ص 96

(20) پریم چند، میدان عمل، لاہور، مکتبہ شعر و ادب، سن ندارد: ص162
(21) پریم چند، گئو دان، لاہور، چوھدری اکیڈمی، سن ندارد: 425
(22) ڈاکٹر مبارک علی، نسل پرستی اور استحصال، لاہور، اہتاس بکس، 1991ء، ص7
(23) کرشن چندر، پہلا پتھر، لاہور، فرخ پبلشرز، سن ندارد: ص33
(24) ایضاً، ص182
(25) قراۃ العین حیدر، گردشِ رنگ چمن، کراچی، مکتبہ دانیال، 1987ء، ص331
(26) خیال امروھوی، نئی سوچ، لاہور، کلاسیک، سن ندارد، ص306
(27) انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1986ء، ص85
(28) انتظار حسین، بستی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1984ء، ص144
(29) انتظار حسین، ''تذکرہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1987ء: ص295
(30) انتظار حسین، آگے سمندر ہے، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1995ء، ص175
(31) عبداللہ حسین، نادار لوگ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1997ء، ص780
(32) مستنصر حسین تارڑ، راکھ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1997ء، ص329
(33) ایضاً، ص418
(34) سہیل بخاری، اُردو ناول نگاری، لاہور، مکتبہ جدید، 1960ء، ص15